کیا کروں؟

نهضت ترجمه
Translation Movement

مؤلف
مہدی رحیمی

مترجم
سید احمد عابدی

بسم الله الرحمن الرحيم

مشخصات

کتاب کا نام	کیا کروں؟
تحریر	مہدی رحیمی
ترجمہ	سید احمد عابدی
نظر ثانی	سید حسین اختر رضوی اعظمی
کمپوزنگ	الغدیر فاونڈیشن ہندوستان
ناشر	ادارہ تحریک ترجمہ
تعداد	ایک ہزار
تاریخ اشاعت	
شابک	

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

خیابان سمیہ بین شہید مفتح و شہید موسوی پلاک ۱۷۳

تہران، ایران فون: ۸۸۸۳۱۴۱۰

www.trans-move.com

فہرست

کیا کروں؟ ۵
گلے میں کانٹا ۴۴
پہلا سبق ۸۶

نهضت ترجمه
Translation Movement

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا کروں؟

کہتے ہیں کہ انسان اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھتا ہے۔ جو کچھ وہ کرتا ہے وہی اس کے سامنے آتا ہے۔ میں کل تک اس بات کو نہیں مانتا تھا۔ لیکن اب مجھ اس کا پورا یقین ہو چکا ہے۔ مگر کیسا یقین۔ تلخ، اس سے زیادہ ہلاک کرنے والا۔ یہ زہر میری رگ رگ میں سما گیا ہے۔

نہیں معلوم، تم نے آج تک آگ کو ہاتھ لگایا ہے یا نہیں؟ لیکن کل میں نے آگ کو ہاتھ لگایا اور اس سے میرا پورا بدن جل اٹھا۔ اس وقت بھی میرا بدن حرارت سے جل رہا ہے۔ اگر اس کا علاج نہ

کروں تو مدتوں اسی طرح جلتا رہوں۔ غرور اور تکبر کی آگ میں تپتا رہوں۔

کل میرا نتیجہ مجھے دیا گیا۔ میری ایک سالہ تعلیم کا نتیجہ، ایک سال پڑھنے لکھنے کا نتیجہ، ایک سال کی محنت اور مشقت کا نتیجہ۔ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن خداوند عالم تمام لوگوں کے اعمال کا حساب و کتاب کرے گا۔ جو شخص مومن ہوگا اور جس نے اچھے کام کئے ہوں گے، اس کا نتیجہ اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اور وہ جنت میں جائے گا۔ لیکن وہ شخص جس نے گناہ کئے ہوں گے اور کفر و شرک اختیار کیا ہوگا، اس کا نتیجہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور وہ جہنم کی دہکتی ہوئی آگ میں ڈالا جائے گا۔

کل میری ایک سال کی پڑھائی کا نتیجہ میرے بائیں ہاتھ میں دیا گیا۔ آج دو دن سے میں اپنے برے اعمال کے باعث جہنم میں جل رہا ہوں۔ ذلت کے خوف سے اونچی آواز میں رو بھی نہیں سکتا اور کسی سے حال دل بیان بھی نہیں کر سکتا۔

میں اور محمد پڑوسی اور دوست تھے۔ ہم چھٹے کلاس میں پڑھتے تھے مدت سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔ ساتھ ہی اسکول جاتے تھے اور ایک دسرے سے اتنے نزدیک تھے کہ دو بھائیوں کی طرح تھے اور ہمیشہ ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک ہوتے تھے۔ ہم دونوں کی عادتیں اور شوق ایک ہی جیسے تھے۔

ہم اکثر ایک دوسرے کے گھر جاتے تھے ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے ناشتہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کبھی ہم ایک دوسرے کے یہاں سو جاتے تھے۔ کبھی میں دن بھر اس کے گھر رہتا تھا اور کبھی وہ میرے گھر۔ ہم ایک ساتھ اسکول جاتے تھے اور ایک ہی ساتھ واپس آتے تھے۔ کلاس میں ایک ساتھ بیٹھتے تھے۔ کھیل کے وقت ہم دونوں ایک ہی ٹیم میں کھیلتے تھے۔ اپنا گھر کا کام بھی ایک ہی ساتھ کرتے تھے اور ساتھ ہی سبق یاد کرتے تھے۔ شام کو ساتھ سودا لینے جاتے تھے اور اکثر اوقات ایک دوسرے کے گھر میں رہ جاتے تھے۔

ہم دونوں پڑھائی میں بھی اچھے تھے اس لئے ساتھ ہی پڑھتے لکھتے تھے۔

سوالات ایک دوسرے سے پوچھتے اور ان کا حل تلاش کرتے تھے۔ سبق یاد کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ ہم دونوں ذہین طالب علم شمار کئے جاتے تھے۔ ہماری کاپیاں ہمیشہ اچھے نمبروں اور بہت عمدہ Very good سے بھری ہوتی تھیں۔ ہم دونوں اکثر و بیشتر اپنے کلاس میں اول آتے تھے۔ ہمیں انعام ملتا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے اس قدر نزدیک تھے کہ لوگ ہماری دوستی کی مثال پیش کرتے تھے۔ اور ہمارے ساتھ دوستی کی آرزو کرتے تھے۔

یہ برادرانہ دوستی دو سال پہلے تک قائم تھی۔ یہاں تک کہ اسکول کھلا اور نئے لڑکوں نے داخلہ لے لیا۔ ان ہی میں

سے ایک کا نام "احمد" تھا۔ یہ لوگ ہمارے محلے میں چند ہی دن پہلے آئے تھے انہوں نے ہماری گلی سے آگے ایک بڑا سا مکان بنوایا تھا۔

یہ لوگ ہماری بہ نسبت زیادہ مالدار تھے۔ احمد کے والد ہر روز اس کو کار میں اسکول لے جاتے تھے۔ اور کار ہی سے واپس لاتے تھے۔

احمد ہمیشہ اچھے اور استری شدہ کپڑے پہنتا تھا۔ اس کا بڑا سا بستہ ہمیشہ رنگین پنسلوں سے بھرا رہتا تھا اور بہت سی قیمتی چیزیں اس میں پڑی رہتی تھیں۔ وہ اپنے گھر کا اکلوتا تھا لہٰذا اس کے ناز سب اٹھاتے تھے اور سب ہی اس سے پیار کرتے تھے۔

ان تمام باتوں کے باوجود احمد پڑھائی میں کمزور تھا البتہ سب کو یقین تھا کہ اس سال وہ چھٹے کلاس میں پہنچ جائے گا۔

بات یہاں سے شروع ہوئی۔ ایک دن اسکول کے میدان میں وہ میرے پاس آیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ میں پڑھائی میں اس کی مدد کروں۔ اس نے بہت زیادہ اصرار کیا۔ لیکن میں نے اس کے جواب میں کہا "میں سوچ کر بتاؤں گا۔"

اسکول میں چھٹی ہو گئی تھی میں باہر محمد کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں احمد کے والد کار لے کر اسے لینے آ گئے۔ احمد نے اپنے والد سے کوئی بات کہی اور میری طرف اشارہ کیا۔ اس کے والد کار سے اتر کر میرے پاس آئے۔ میں نے سلام کیا۔

انہوں نے جواب سلام دیا۔ اور اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا میں پڑھائی میں احمد کی مدد کروں۔ میں انکار نہیں کر سکا میں نے مجبوراً قبول کر لیا۔ اس سے احمد بہت خوش ہوا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کار میں بٹھانے لگا۔ میں نے انکار کر دیا اور کہا میں آپ کے ساتھ ضرور چلتا لیکن اپنے دوست محمد کا انتظار کر رہا ہوں۔

چنانچہ وہ لوگ بھی محمد کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ محمد آ گیا۔ میں نے محمد سے کہا کار میں یہ لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہیں تاکہ ہمیں گھر پہنچا دیں۔ محمد یہ سنتے ہی چونک پڑا اور اس نے مخالفت کی۔ لیکن میرے بہت زیادہ اصرار

کرنے پر راضی ہو گیا۔ ہم کار میں نرم نرم سیٹ پر بیٹھ گئے۔ واقعاً کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ مجھے اس وقت اور زیادہ لطف آیا جب میں نے دوسرے لڑکوں کو اپنی طرف حسرت سے نگاہ کرتے ہوئے دیکھا۔ اس دن میں کار سے گھر آیا۔

اس دن شام کو پہلی بار اپنے پرانے دوست محمد سے جدا ہوا تاکہ احمد کے گھر جا کر اس کو پڑھا سکوں۔

احمد کا گھر کافی بڑا اور سجا ہوا تھا۔ ہم لوگ بھی اگرچہ فقر نہیں تھے بلکہ ایک متوسط زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہمارے رشتہ دار بھی پیسہ والے تھے لیکن احمد کا گھران سب سے بڑا تھا۔ اس دن میں نے احمد کو دو گھنٹہ پڑھایا۔

احمد کو پڑھانا میرے لئے بہت مشکل تھا۔ وہ بہت ہی کند ذہن اور سست تھا۔ پڑھائی کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا تھا۔ ہمیشہ اپنی بڑائی اور کھیل کود کی باتیں کرتا تھا۔ اپنے سفر اور فلموں کے بارے میں بتاتا رہتا تھا۔ پہلا دن میرے لئے بہت ہی سخت گذرا۔ میں اپنے آپ سے کہنے لگا کہ آئندہ اسے چھوڑ دوں گا اور اپنے پرانے دوست محمد ہی کے پاس رہوں گا۔

دوسری مرتبہ احمد نے مجھے اپنے گھر بلایا۔ میں بہانہ کرکے ٹال گیا۔ میں نے کہا بیمار ہوں۔ میرا دل نہیں چاہتا۔ اس نے بہت زیادہ اصرار کیا اور کہا "مجھے تو آپ میں کوئی بیماری نظر نہیں آرہی ہے۔

اگر دوسری کوئی بات ہے تو صاف صاف کہہ دو۔"

میں نے کہا: "تم بس اپنی بڑائی ہی بیان کیا کرتے ہو لیکن پڑھائی کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے، اس طرح تو پڑھائی نہیں ہو سکتی۔" اس دن بھی ڈیڑھ گھنٹہ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں صرف آدھا گھنٹہ ہی سبق پڑھا تھا۔

اس نے وعدہ کیا آئندہ وہ کبھی بھی ادھر اُدھر کی باتیں نہیں کرے گا اور پوری توجہ سے سبق پڑھے گا۔ میں نے بہت مجبور ہو کر اس کی شرط قبول کر لی۔ اس دن اس نے باتیں کم کی اور سبق پڑھنے پر زیادہ وقت صرف کیا۔

اتوار کا دن تھا، میں ابھی نہا کر نکلا تھا اور بالوں میں کنگھی کر رہا تھا کہ گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ تو سامنے احمد کھڑا تھا۔ اس کے اس وقت آنے سے مجھے تعجب ہوا۔ میں نے اس کو اندر بلایا۔ وہ گھر میں آیا اور تھوڑی دیر بیٹھا۔ میں اس کے لئے مٹھائی لایا۔ اس نے جلدی جلدی مٹھائی کھائی۔ اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ میں نے اس سے کہا:

"گھڑی کیوں دیکھ رہے ہو"

دیر ہو رہی ہے۔

کس چیز میں دیر ہو رہی ہے۔

سنیما میں۔

سنیما۔ کون سا سنیما؟

آج سنیما ہال میں ایک فلم دکھائی جارہی ہے۔ بالکل نئی فلم ہے۔ اگر دیکھنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ چلو۔

میں نے جواب دیا۔ حسب معمول میں آج اپنے گھر والوں کے ساتھ نماز پڑھنے جاؤں گا اور ابھی تھوڑی دیر میں محمد بھی آتا ہوگا۔

لیکن احمد نے بہت زیادہ اصرار کیا۔ اتنا اصرار کیا کہ مجھ سے انکار کرتے نہ بنا۔ میں اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہوگیا۔ چلتے وقت میں نے ماں سے کہا۔ "اگر محمد آئے تو اس سے کہہ دیجئے گا مجید ایک اہم کام سے گیا ہے اس لئے آج نماز میں نہیں آسکے گا۔"

اس دن میں فلم دیکھنے گیا۔ میرا ٹکٹ احمد ہی نے لیا، وہ دن میرا بہت اچھا گذرا، فلم بھی بہت اچھی تھی۔ شاید اسی لئے شیطان نے مجھے ورغلایا تھا تاکہ میں فلم دیکھنے کا عادی بن جاؤں۔

اس طرح کے واقعات سال بھر ہوتے رہے۔ روزانہ شام کو دو تین گھنٹہ احمد کے یہاں رہتا تھا۔ ہم تھوڑی دیر پڑھتے تھے بقیہ وقت کھیل کود میں گذارتے یا ایک دوسرے کو قصہ سنایا کرتے تھے۔

میں جس قدر احمد سے نزدیک ہوتا گیا اتنا ہی محمد سے دور ہوتا گیا۔ گرچہ محمد روزانہ شام کو میرے گھر آتا تھا اور بہت

زیادہ اصرار کے ساتھ مسجد لے جانا چاہتا تھا تاکہ جماعت سے نماادا کریں۔

میں نے رفتہ رفتہ مسجد جانا کم کر دیا۔ زیادہ تر گھر ہی میں نماز پڑھتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد میرے لئے نماز پڑھنا بھی مشکل ہوگیا۔ اب نماز کے لئے دل نہیں آمادہ ہوتا تھا۔ نماز کے عالم میں بھی میرا دل فلم اور کھیل میں لگا رہتا تھا۔ اب تو نماز بھی قضا ہونے لگی تھی۔ شروع میں قضا نمازیں فوراً پڑھ لیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ عادت بھی چھوٹ گئی۔

میں اور احمد ہفتہ میں دو تین مرتبہ ضرور فلم دیکھتے تھے۔ کبھی وہ میرا ٹکٹ لیتا تھا اور کبھی میں۔

چند مہینے گذر گئے۔ اب ہم اسٹیڈیم جانے لگے تھے۔ وہاں کے کھیل دیکھنے کے عادی ہوگئے۔ اس کے بعد ہم ایک کھیل کے کلب کے ممبر بھی بن گئے تاکہ کراٹہ سیکھیں۔ اب ہمارا زیادہ وقت یا پارک میں بسر ہوتا تھا یا کلب میں۔

یہاں تک پڑھائی کا سال تمام ہوگیا۔ محمد بہت اچھے نمبروں سے پورے کلاس میں اول آیا۔ میں جو ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتا چلا آیا تھا۔ اس مرتبہ میرا نمبر بہت ہی کم تھا۔ احمد کو تین مضامین کا دوبارہ امتحان دینا تھا۔

گرمی کی چھٹیاں ہوئیں۔ محمد کو مسجد کی طرف سے ایک جگہ تبلیغ کرنے بھیجا گیا۔ محمد کا چلا جانا میرے لئے غضب

ہوگیا۔ کیونکہ جب تک محمد محلّہ میں تھا مجھے زبردستی مسجد لے جاتا تھا۔ نماز اور دعائے کمیل وغیرہ میں مجھے اپنے ساتھ لے جاتا تھا اور مجھے ہمیشہ احمد کے ساتھ نہیں رہنے دیتا تھا۔ محمد کے چلے جانے سے میری اور احمد کی دوستی اور زیادہ پکی ہوگئی۔ اب ہم رات دن ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ فلم، پارک، کراٹہ، ٹیبل ٹینس، فٹبال، والی بال، باسکٹ بال، اسٹیڈیم۔۔۔ بس انہیں چیزوں میں وقت گذرتا تھا۔

جولائی کا مہینہ آیا۔ احمد نے تین مضامین کا امتحان دیا اور کامیاب ہوگیا۔ محمد بھی تبلیغ سے واپس آ گیا تھا۔ اب ہم تینوں ساتویں کلاس میں گئے۔

اس سال میں محمد سے بالکل ہی دور رہا۔ محمد بار بار میرے گھر آیا۔ کتنی مرتبہ اس نے اسکول میں بات کی۔ مجھے کتنا سمجھایا کہ احمد سے اتنا زیادہ قریب نہ رہوں ۔ لیکن میں نہیں مانا۔ بلکہ غصہ میں آکر محمد سے ناراض ہوگیا۔ میں نے گھر میں بھی کہہ دیا تھا، اگر محمد میرے پاس آئے تو کہہ دیں کہ میں نہیں ہوں۔ اسکول میں بھی محمد سے دور دور رہتا تھا۔ اپنے کو محمد سے الگ رکھتا تھا۔ کوشش کرتا تھا کہ محمد کا سامنا نہ ہو۔

صبح احمد کے ساتھ اس کی کار میں اسکول جاتا تھا۔ اور شام کو اسی کے ساتھ واپس آتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد پھر احمد کے گھر چلا جاتا تھا۔ اب پڑھائی سے کوئی

مطلب نہیں تھا۔ اب تو بس یہی باتیں ہوتی تھیں کہ کون سی نئی فلم دیکھی جائے، کون سا کھیل کھیلا جائے اور کس ٹیم میں شرکت کی جائے۔

یہ سال بھی کھیل کود اور تفریح میں گذر گیا۔ جب نتیجے کا وقت آیا اور نتیجہ ہمارے ہاتھوں میں دیا گیا تو اس مرتبہ بھی محمد کلاس میں سب سے آگے تھا اور اس کا نمبر سب سے زیادہ تھا۔ میرے نمبر پچھلے سے بھی کم تھے۔ احمد پانچ مضامین میں فیل تھا۔

اس سال بھی گرمیوں کی چھٹیاں گذشتہ سال کی طرح گذری۔ محمد اس سال بھی تبلیغ کرنے کے لئے گیا تاکہ لوگوں کی مدد کرکے خدا سے نزدیک ہوسکے۔ جب

کہ میں اور احمد روزانہ خدا سے دور ہو رہے تھے غفلت اور کھیل کود میں ڈوبے جا رہے تھے۔ جولائی کا مہینہ آیا اور احمد نہ معلوم کس طرح پاس ہو گیا۔ محمد خوش و خرم اور پہلے سے زیادہ محنت پر آمادہ ہو کر گھر واپس آیا۔

کلاس شروع ہوئی محمد نہایت پابندی اور شوق سے اسکول جاتا رہا تاکہ علم حاصل کرکے جہالت دور کرے۔ اور خدا کی راہ میں لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے اپنے علم سے استفادہ کرسکے۔ میں اور احمد مجبوراً اسکول جاتے تھے اور اس وقت کے منتظر تھے کہ کسی طرح یہ مصیبت دور ہو۔

جوں توں کرکے یہ آٹھویں کلاس بھی ختم ہوئی۔ ہم اپنا نتیجہ لینے اسکول گئے تاکہ ایک سال کی محنت کا پھل دیکھیں۔

محمد کی اعلیٰ کامیابی کا نتیجہ اس کے داہنے ہاتھ میں دیا گیا۔ اپنے نمبروں کی بنا پر پورے کلاس میں اس کی پہلی پوزیشن تھی۔ پرنسپل اور دیگر اساتذہ نے اس کو شاندار کامیابی پر مبارکباد دی۔ دوستوں نے اس کو گلے سے لگایا۔ بچوں نے اس کی کامیابی کا جشن منایا۔ پورا اسکول لڑکوں کی خوشی سے جھوم اٹھا۔

میں نے اور احمد نے بھی اپنے اپنے نتیجے لئے۔ داہنے ہاتھ میں نہیں بلکہ بائیں ہاتھ میں۔ خوشی کے لئے نہیں بلکہ شرمندگی کے ساتھ۔ یہ پہلا موقع تھا کہ

میں تین پرچوں میں فیل تھا اور احمد کو پانچ چیزوں کا امتحان پھر سے دینا تھا۔

غمزدہ، پریشان حال، سر جھکائے گھر کی جانب چلا۔ ذہن میں یہ سوال تھا کہ والدین کو کیا جواب دوں گا۔ محمد اور ان کے دوست خوش و خرم جلدی جلدی اپنے اپنے گھر پہنچے۔ ان کی خوش خوش باتوں سے پورا محلّہ گونج رہا تھا۔ جب ہم اپنے گھر کے نزدیک پہنچے، میں نے دیکھا محمد کی والدہ کچھ چیزیں خریدنے بازار جارہی ہیں۔ محمد نے جب ماں کو دیکھا تھوڑی دیر ماں سے گفتگو کی اور اپنا نتیجہ نکال کر ماں کو دکھایا۔ ماں نے غور سے نتیجہ دیکھا۔ پھر جھک کر بچے کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ محمد

نے ماں کے ہاتھوں کو چوما۔ اور نتیجہ لے کر جلدی جلدی گھر کو چلا۔

جب محمد کی والدہ میرے سامنے سے گذریں۔ میں نے سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا۔ ابھی ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو خشک نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے میرا نتیجہ دریافت کیا۔ میں نے کہا میں بھی پاس ہوگیا ہوں۔ انہوں نے نہایت مسرت سے مجھے دعائیں دیں۔ "خدا تمہیں ہمیشہ کامیاب کرے ۔ اور تمہیں اس بات کی توفیق دے کہ تم اسلام کی خدمت کرسکو۔"

جب میں گھر پہنچا۔ میری والدہ اور چھوٹے بھائی بہن میرا انتظار کررہے تھے۔ جب انہوں نے میرے نتیجہ کے بارے

میں دریافت کیا۔ تو میں نے کہہ دیا۔ پاس ہوگیا ہوں۔ یہ سن کر سب خوش ہوگئے۔ لیکن اس جھوٹ پر میں خود بہت شرمندہ تھا۔ مجھے ڈر تھا میرا جھوٹ کھل نہ جائے اور عزت چلی جائے۔ اماں نے مجھے کلیجہ سے لگایا۔ مجھے مٹھائی کھلائی۔ اس کے بعد میرا نتیجہ مانگا۔ میں نے کہا میرا نتیجہ احمد کے پاس ہے وہ لے گیا ہے تاکہ اپنے نمبروں سے ملا سکے۔ اس پر میری ماں نے کچھ نہیں کہا۔

رات ہوئی۔ میرے والد گھر آئے۔ میں نے پھر وہی جھوٹ دہرایا۔ میرے والد بھی یہ سن کر بہت خوش ہوئے انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا کل مجھے سائیکل انعام میں دیں گے۔ دوسرے دن

والد سائیکل لے کر گھر آئے۔ اس وقت میرے علاوہ سب خوش تھے۔ میں اندر اندر کانپ رہا تھا۔ اور جھوٹ کے انجام پر غور کر رہا تھا۔ اگر یہ جھوٹ کھل گیا تو پورے خاندان اور پورے محلّہ میں میری بے عزتی ہوگی کیونکہ میری ماں نے ہر ایک کو میری کامیابی سے مطلع کر دیا تھا۔

دوبارہ پھر چھٹیوں کے دن آ گئے۔ پھر وہی کھیل کود وہی پڑھائی سے دوری۔ اب میری اور احمد کی تفریحوں میں اور اضافہ ہو چکا تھا۔ اب میں گھنٹوں سائیکل ہی چلاتا رہتا تھا۔ اس قدر سائیکل چلاتا تھا کہ پیروں میں درد ہونے لگتا تھا۔ یا بھوک ستانے لگتی تھی ۔ تب میں گھر واپس آتا تھا۔ کبھی سائیکل چلاتے

چلاتے چٹیل میدانوں کی طرف نکل جاتا تھا وہاں موٹر سائیکل کی ریس دیکھتا تھا۔ لوگ اپنی چھوٹی بڑی موٹر سائیکل کے ساتھ اس ریس میں شرکت کرتے تھے وہ اونچی اونچی جگہوں سے چھلانگ لگاتے تھے۔ تیزی سے اوپر جاتے تھے اور تیزی سے نیچے آتے تھے۔ ہم ان کے پاگل پن پر ہنستے تھے اور وہ ہماری تعریفوں سے خوش ہو جاتے تھے۔

اس وقت مجھے بھی موٹر سائیکل کا شوق تھا۔ میرے والد نے مجھ سے کہا۔ "اگر تم اس سال بھی امتحان میں پاس ہوگئے تو میں تمہارے لئے موٹر سائیکل خرید دوں گا۔"

چھٹیوں کے چند دن گذرے تھے کہ مجھے اپنا سپلیمنٹری (SUPLIMENTRY) یاد آیا کہ مجھے کچھ مضامین کا امتحان دینا ہے۔ اس سے فرار کی کوئی صورت نہیں تھی۔ میں نے والد سے ڈیڑھ ہزار روپیہ لئے کہ میں کوچنگ جانا چاہتا ہوں تاکہ آئندہ کلاس کے لئے پہلے ہی سے تیار رہوں اور اگر ہوسکے تو نویں جماعت کا امتحان دے کر اسی سال ہائی اسکول کا فارم بھر دوں۔

یہ سن کر والد بہت ہی زیادہ خوش ہوئے اور انہوں نے روپئے دے دیئے۔

جب کہ مرا ارادہ یہ تھا کہ اس رقم سے اپنے امتحان کی تیاری کروں گا تاکہ

جن مضامین میں فیل ہو گیا ہوں اس کی تیاری کر سکوں اور امتحان دے سکوں۔

لیکن یہاں پھر احمد نے مجھے شیطان کی طرح بہکایا اور مجھ سے کہنے لگا "تم تو پڑھنے میں اتنے تیز ہو اور ماشاء اللہ اتنے ذہین ہو اگر تم نے صرف ایک رات جم کر محنت کر لی تو تمہاری کامیابی یقینی ہے۔"

اس نے یہ بات اتنی مرتبہ کہی کہ مجھے واقعاً یقین ہو گیا اور میں نے کوچنگ جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ چند روز کے بعد احمد اور دوسرے دوستوں کے ہمراہ ایک جگہ گھومنے گئے اور وہ ڈیڑھ ہزار روپے اس تفریح کی نذر ہو گئے۔

گرمی کی چھٹیاں تیزی سے گذر گئیں۔ میں صبح ہی کھیلنے کے لئے گھر سے

نکل جاتا تھا والدین یہ سمجھتے تھے کہ میں کوچنگ میں گیا ہوں۔ لیکن میں گھر سے سیدھے احمد کے پاس جاتا تھا اس کے ساتھ ، فلم دیکھتا، پارک میں اور ادھر اُدھر گھوما کرتا تھا۔ اور دنیا کی لذتیں حاصل کرتا تھا۔

جولائی کا مہینہ آیا اور مجھے پھر امتحان کی فکر ستانے لگی۔ اب مجھ پر خوف طاری ہوگیا تھا۔ چھٹیوں میں ایک دن بھی سبق نہیں پڑھا تھا بلکہ جو کچھ یاد تھا وہ بھی بھول چکا تھا۔ چند دن تک میں نے پڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن فیل ہوجانے کا خوف، جھوٹ کے کھل جانے کا اندیشہ پھر خاندان اور محلّہ میں بدنامی سب سے بڑھ کر والدین کی ناراضگی۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر والد صاحب کو معلوم ہوگیا تو ان کی قہر

آلود نگاہیں میرے لئے خنجر سے زیادہ تکلیف دہ ہوں گے۔ ان تمام باتوں نے ساری توجہ سلب کرلی۔ جب پڑھنے بیٹھتا تھا تو بس یہی خیالات پریشان کئے رہتے تھے۔ کتاب کھول کر پڑھنے کی کوشش کرتا تھا مگر ایک حرف سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کتاب سامنے ہوتی تھی اور ذہن کھیل اور تفریح کی سیر کیا کرتا تھا۔ کبھی ایسا لگتا تھا کہ لوگ مجھے دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ کبھی ایسا لگتا تھا کہ والد صاحب نے اتنا مارا ہے کہ بدن پر نشان پڑ گئے ہیں۔ میری ماں ایک طرف بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔ کبھی ایسا لگتا تھا کہ میرا نتیجہ میری ماں کے ہاتھ میں دے دیا گیا اس کو دیکھ کر ان پر دل کا دورہ پڑ گیا

ہے۔ اسی طرح کے خیالات آتے رہتے تھے۔ سر میں درد ہونے لگتا تھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ پھر کتاب کا ایک حرف بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

کتاب بند کر دیتا تھا تاکہ آنسو کے قطرے کتاب پر نہ گریں۔

آخر کار امتحان کا دن آ پہنچا ایسا لگتا تھا کہ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا دل انجن کی طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ درد کے مارے سر اور گردن کا برا حال تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا تھا۔ جب مجھے پرچہ دیا گیا میں نے جلدی سے سوالات پڑھے۔ سوالات پڑھ کر چکر سا آگیا اور دنیا آنکھوں کے سامنے تاریک ہو گئی۔ "خدایا سوالات کتنے زیادہ سخت ہیں۔"

نہیں معلوم وقت کس طرح گذرا بس اتنا معلوم ہے کہ انہیں باتوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ استاد نے آکر کہا "وقت ختم ہو چکا ہے۔" اور یہ کہہ کر مجھ سے کاپی لے لی۔

میں نے امتحانات دیئے۔ تین دن کے بعد نتیجہ ملنا تھا۔ یہ تین دن میرے لئے تین صدیوں کے برابر تھے۔ ان تین دنوں میں مجھے بالکل ہوش نہیں تھا۔ نہیں معلوم ان تین دنوں میں کیا کھایا؟ کیا پیا؟ رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ آنکھیں سوج گئی تھیں فیل ہو جانے کا ڈر، ماں کے دل کی بیماری کا خوف۔ باپ کی بے عزتی ان کی مایوسی۔ لوگوں کی ہنسی۔ ایک دیو کی طرح مجھے ہر وقت گھیرے رہتے تھے۔

تین دن کے بعد احمد کے ساتھ نتیجہ لینے گیا۔ احمد پاس ہوگیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ اسکول میں مشہور یہ تھا کہ یہ نتیجہ خریدا گیا ہے۔ یا یہ کہ احمد نے مجھے بتائے بغیر چپکے چپکے تیاری کی ہے۔ لیکن میں۔

جب بتایا گیا کہ میں "فیل" ہوگیا ہوں، چکرا کر زمین پر گر پڑا۔ کچھ لوگوں نے مجھے اٹھایا۔

ایک آدمی نے منہ میں پانی ڈالا۔ مجھے اٹھا کر بٹھایا تھوڑی دیر بعد مجھے ہوش آیا۔ دیکھا سب مجھے گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ اور احمد جاچکا تھا۔ سر جھکائے کسی سے نگاہ ملائے بغیر دفتر سے باہر آگیا۔

کل سے آج تک شرمندگی کی بنا پر گھر نہیں جاسکا ہوں۔ اس وقت احمد کے گھر میں ہوں اور سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کروں۔ والدین یہ خیال کررہے ہیں کہ میں نویں کے امتحان میں پاس ہوچکا ہوں اب ہائی اسکول میں جاؤں گا۔ وہ یہ سوچ رہے ہیں میں نے چھٹیوں میں جم کر محنت کی ہے اور اس سال ہائی اسکول میں میرا پہلا نمبر ہوگا۔

والد نے کوچنگ کے لئے ڈیڑھ ہزار روپے دیئے تھے۔ امتحان میں کامیابی سن کر مجھے سائیکل انعام دی تھی تاکہ اور زیادہ دل لگا کر پڑھوں۔ خاندان والوں کو یقین ہے کہ اس دوسرے امتحان میں بھی پاس ہوگیا ہوں۔ اپنے پاس ہوجانے کے

بارے میں اتنا زیادہ جھوٹ بولا ہے کہ اب حقیقت سے ڈر رہا ہوں۔

کل محمد میرے پاس آیا تھا اس نے کہا۔ "میں کل مسجد گیا تھا، مولانا صاحب نے قرآن کریم کی چند آیتوں کی تلاوت کی تھی اور ان کا ترجمہ اور تفسیر بیان کی تھی، سنتے ہی مجھے تمہارا خیال آیا یہ آیتیں قیامت کے بارے میں ہیں اور ان میں یہ بتایا گیا ہے:

"لیکن وہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ نہایت شرمندگی اور خوف سے کہے:

اے کاش میرا نامہ اعمال مجھے نہ دیا جاتا میں اپنے اعمال سے واقف نہ ہوتا۔

اے کاش مجھے موت آجاتی مجھے اس عذاب سے چھٹکارا مل جاتا۔

لعنت ہو مجھ پر ۔ اس روز میری دولت بھی میرے کام نہ آئی۔ میری ساری قدر و عزت خاک میں مل گئی۔

اس وقت خدا کی جانب سے یہ حکم ہوگا:

اس کو پکڑو۔ زنجیر میں جکڑو۔ اور دہکتی ہوئی آگ میں پھینک دو۔ پھر ایسی زنجیر میں جو ستر گز لمبی ہے اس کو جکڑ کر جہنم میں کھینچو۔"[1]

پھر محمد نے مجھ سے کہا میں اپنے والدین کے پاس جاؤں اور اپنی غلطی کا

---

[1] سورہ حاقہ، آیت/۲۵۔۳۲

اعتراف کروں سارا ماجرا بیان کردوں اور ان سے گذارش کروں کہ مجھے معاف کردیں۔ محمد نے یہ بھی کہا کہ اس سلسلے میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں اور تمہاری طرف سے تمہارے والدین سے بات کروں ۔ لیکن میں نے بدنامی کے خوف سے محمد کا مشورہ قبول نہیں کیا محمد نے بہت اصرار کیا اور کہا۔ "دنیا کی بدنامی آسان ہے۔ قابل برداشت ہے وقتی ہے۔ لیکن قیامت کے دن خدا کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ اپنی گناہوں سے توبہ کرو اور ایسا کام کرو کہ آخرت میں شرمندہ نہ ہو۔ وہاں ذلیل نہ ہو۔ کیونکہ وہاں کی ذلت سے چھٹکارا نا ممکن ہے۔

میں اس قدر خوف زدہ تھا کہ میں نے محمد کی بات قبول نہیں کی۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر ماں کو معلوم ہوگیا تو ان پر دل کا دورہ پڑ سکتا ہے۔ اور عجب نہیں وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں والد ہمیشہ کے لئے مجھ سے ناراض نہ ہو جائیں اور مجھے گھر سے باہر نکال دیں۔ مجھے ڈر ہے کہ خاندان والے، رشتہ دار، محلے والے میرا مذاق نہ اڑائیں۔ مجھ پر انگلیاں نہ اٹھائیں۔ مجھے یہ بھی ڈر ہے کہ ہمیشہ کے لئے دوستوں میں بدنام ہو جاؤں اور میری عزت ختم ہو جائے۔

اسی طرح کے خیالات سے پریشان ہوں ذہن کا عجب عالم ہے۔ کوئی صحیح

فیصلہ نہیں کر سکتا۔ کل سے بستر پر پڑا ہوں بیمار ہو گیا ہوں ۔ بخار کافی تیز ہے۔ الٹی سیدھی باتیں کر رہا ہوں۔ احمد اپنے کام میں مگن ہے۔ اس نے آج تک پلٹ کر بھی نہیں پوچھا کہ کیا حال ہے۔ آج میری طبیعت کچھ سنبھلی ہے لیکن یہ فکر مجھے پریشان کئے ہوئے ہے کہ "کیا کروں" آپ کو خدا کے لئے کوئی حل تلاش کر دیجئے کہ میں کیا کروں؟

گلے میں کانٹا

امیر المومنین علیہ السلام

"میں نے دیکھا صبر کرنا عقلمندی ہے۔ میں نے اس حالت میں صبر کیا کہ میری آنکھ میں تنکا تھا اور حلق میں کانٹا۔ میں دیکھ رہا تھا اور میری میراث برباد کی جارہی تھی۔"

(نہج البلاغہ، تیسرا خطبہ)

علی گھر میں داخل ہوا اور بلند آواز سے سلام کیا۔ اس کے ماں باپ دستر خوان پر بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ انہوں نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ علی کا چھوٹا بھائی جس کی عمر تین سال سے زیادہ نہ تھی۔ میٹھی میٹھی باتیں کرتا تھا۔اس نے کہا:

"جناب علی صاحب سلم علیکم"

یہ سنتے ہی سب ہنس پڑے۔ کیونکہ یہ جملہ مرتضٰی نے اپنے والد کی زبانی سنا تھا۔ اس کے معنی سے ناواقف تھا۔ والدین کو ہنستا دیکھ کر وہ بھی ہنسنے لگا۔

ماں نے کہا۔ "علی جلدی ہاتھ دھو کر آو۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

علی نے جلدی سے بستہ ایک طرف رکھا۔ اسکول کا لباس بدلا۔ ہاتھ منہ دھو کر دستر خوان پر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اس نے ماں سے سوال کیا "آج کھانے میں کیا ہے۔"

ماں نے جواب دیا۔ "آج مچھلی اور پلاؤ ہے۔"

علی نے خوش ہو کر کہا۔ "اماں ایک پلیٹ بھر کر میرے لئے رکھ دیجئے۔ آج تو مزا آئے گا۔"

ماں نے ایک پلیٹ میں اس کا کھانا نکال دیا۔ علی نے جلدی جلدی کھانا شروع کیا۔ علی کے جلدی کھانے پر ماں کو

تعجب ہوا۔ کہنے لگی۔ "کیا بات ہے کیا کوئی تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے۔ اتنی جلدی کس لئے۔"

باپ نے کہا۔ "بسم اللہ نہ بھولنا۔"

اس نے اسی بھرے منھ سے کہا۔ اوہ اوہ میں واقعاً بھول گیا تھا۔ خیر اب سہی "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کانٹوں کا خیال کئے بغیر وہ جلدی جلدی مچھلی کھاتا رہا۔

ابھی تھوڑی دیر گذری تھی کہ علی کی آواز پر سب چونک پڑے۔ " ارے، اوہ۔ وہ۔ ہ۔ ہ۔"

ماں نے کہا "کیا ہوا؟"

علی نے گلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نہایت درد بھرے لہجہ میں کہا۔ "ایسا لگتا ہے گلے میں کانٹا اٹک گیا ہے۔"

ماں نے کہا۔ "منع کر رہے تھے کہ اتنی جلدی نہ کھاؤ۔"

ماں کی نصیحت نے علی کے درد میں اور اضافہ کر دیا۔ اس نے بڑی بے چارگی سے کہا۔ "کیا کرتا بھوک ہی بہت لگی تھی۔"

نهضت ترجمه
Translation Movement

باپ جو اب تک خاموش بیٹھے تھے علی سے کہا۔ "کس طرح کانٹا نگل گیا۔"

علی نے کہا۔ بس ایسے ہی۔ "ایک مرتبہ ہلکی سی خراش محسوس ہوئی اس کے بعد گلے اور سینہ میں تیز درد۔"

باپ نے کہا۔ "تھوڑا سا پانی پی لو ہو سکتا ہے نیچے اتر جائے۔"

علی نے پانی پیا۔ مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ماں نے کہا۔ "ایک لقمہ روٹی گلے سے اتارو۔ ہو سکتا ہے اس طرح کانٹا نیچے اتر جائے گا۔"

علی نے روٹی کا ایک ذرا بڑا ٹکڑا لیا اور بغیر چبائے محنت سے اسکو گلے سے اتارا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

ماں نے اس کی تسلی کے لئے کہا۔ "کوئی خاص بات نہیں ہے ٹھیک ہو جائے گا۔" باپ اپنی جگہ اٹھے۔ علی کا منھ کھول

کر گلے کو ہر طرف سے دیکھا۔ لیکن کچھ دکھائی نہیں دیا۔

چند مرتبہ آہستہ آہستہ اس کی گدی اور پیٹھ پر مارا تاکہ کانٹا اتر جائے۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کانٹے نے گلے میں جگہ بنا لی تھی۔ علی کھانا نہ کھا سکا۔ وہ روہانسا ہوگیا۔ ماں نے علی کا روہانسا چہرہ دیکھ کر کہا۔ "تھوڑی دیر صبر کرو خود بخود اتر جائے گا۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

گلا سہلاتا ہوا علی دسترخوان سے اٹھ گیا۔ کمرے میں ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ تھک گیا تھا۔ صبح سے اس وقت تک اسکول میں تھا۔ آج کچھ زیادہ محنت کرنا پڑی تھی۔ آج وہ کھیلا بھی تھا۔ تھوڑی دیر ایسے ہی بیٹھا رہا۔ اس نے منھ میں لعاب

جمع کرکے نگلنا چاہا۔ گلے میں شدید جلن اور درد کا احساس ہوا۔ اب درد پہلے سے زیادہ تھا۔ اس کی آنکھوں کے حلقے درد سے سیاہ ہوگئے تھے۔

علی نے اس وقت خود ہی سوچا پہلے نماز پڑھ لینا چاہئے۔ کیونکہ تھوڑی دیر کے بعد نیند آسکتی ہے۔ یا پھر دوست آجائیں گے اور نماز پڑھنے کا موقع نہیں ملے گا۔ علی نے اٹھ کر وضو کیا اور نماز پڑھی۔ گلے میں اسی طرح درد ہورہا تھا۔ وہ حمد اور سورہ قاعدے سے نہیں پڑھ پا رہا تھا۔ وہ کوشش کررہا تھا اس طرح پڑھے کہ گلے میں درد نہ ہو یا ہو تو کم ہو۔

نماز کے بعد اس نے سوچا کہ بہتر ہے تھوڑی دیر سو جائے۔ اور دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ "کتنا اچھا ہو جب میں اٹھوں تو درد ختم ہو چکا ہو۔" یہ سوچ کر اپنے کو تسلی دی اور اسی امید کے ساتھ لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن نیند کہاں۔ ذہن میں طرح طرح کے خیالات آتے رہے۔ اس نے بہت کوشش کی کہ خیالات نہ آنے پائیں۔ ادھر ایک خیال سے نجات ملتی تھی ادھر اُدھر کروٹ بدلتا رہا۔ ایک مرتبہ، دو مرتبہ، دس مرتبہ۔ آنکھیں بند کیں مگر نیند نہ آنا تھی نہ آئی۔ اپنے آپ سے کہنے لگتا۔ یہ کام بھی نہیں ہوا۔

اس نے گھڑی پر نگاہ کی ساڑھے تین بج چکے تھے۔ یعنی وہ ڈیڑھ گھنٹے سے لیٹا ہوا تھا لیکن سو نہیں سکا تھا۔ ان تمام باتوں کے علاوہ گلے میں درد بھی تھا اور جلن بھی۔ اس کا حوصلہ پست ہوگیا تھا۔ کمرے سے باہر نکلا۔ ہاتھ منھ دھویا شاید کچھ فائدہ ہو۔ وہ حوض کے کنارے بیٹھا رنگین مچھلیاں دیکھتا رہا۔ اپنے سے کہنے لگا۔ "کاش میں بھی مچھلی کی طرح ہوتا بے فکری کے ساتھ پانی میں تیرتا رہتا۔"

چند منٹ گذرے تھے کہ دھوپ کی شدت نے اسے تنگ کیا۔ اس کا سر جلنے لگا۔ کمرے میں واپس آگیا۔ بستہ کھولا۔

کتابیں کاپیاں نکالیں تاکہ ہوم ورک (HOME WORK) کرلے۔ چند سطریں لکھی تھیں کہ دل اچاٹ ہوگیا۔ دیر تک کتاب کھولتا بند کرتا رہا کاپیوں پر لکیریں کھینچتا رہا۔ اسی طرح ایک صفحہ بھر ڈالا۔ اس وقت اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ اتنے میں ماں کی آواز آئی۔ "علی آؤ چائے پی لو۔

علی اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور ماں کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ ماں نے چائے بنا کر دی۔ وہ ٹھنڈی ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ چائے پی۔ جیسے جیسے چائے گلے سے نیچے اترتی تھی درد بڑھتا تھا۔ وہ پوری طرح چائے بھی نہیں پی سکا۔

ماں غور سے علی کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا ابھی درد ہو رہا ہے؟"

علی نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں تھوڑا تھوڑا ہو رہا ہے۔" اسی کے ساتھ ہی علی اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ اس مرتبہ اس نے ایک صفحہ لکھا۔ پھر دوبارہ گلے کی تکلیف نے اس کو اپنی طرف متوجہ کر دیا۔ دھیرے دھیرے گلا سہلانے۔ اور سوچنے لگا کہ آخر کیا ہوگا۔ ساڑھے چار بج گئے ہیں ابھی تو صرف ایک صفحہ لکھا ہے۔ اس کے بعد اس نے لکھنے کی بہت کوشش کی مگر نہ لکھ سکا۔ اس نے کتاب و کاپی بستہ میں رکھ دی۔ اور کھیل کا جوتا پہن کر کھیلنے چلا گیا۔

ایک دو آدمی وہاں موجود تھے۔ رفتہ رفتہ اور دوست بھی آ گئے۔ جب اچھے خاصے لوگ جمع ہو گئے تو آپس میں دو ٹیمیں بنا کر فٹبال کھیلنے لگے۔ چند اینٹوں سے گول بنایا۔

علی کا دل کھیلنے کے لئے آمادہ نہیں تھا وہ اندر سے بجھا بجھا سا تھا۔ گلے میں جلن ہو رہی تھی وہ ڈر رہا تھا کہیں درد بڑھ نہ جائے۔ دوستوں نے دیکھا کہ آج علی کچھ نڈھال سا نظر آ رہا ہے۔ انہوں نے پوچھا "کیا ہو گیا؟"

علی نے کہا۔ "گلے میں کانٹا اٹک گیا ہے۔" یہ سنتے ہی بعض دوست ہنس پڑے اور بعض نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ایک

نے کہا۔ "چلو کھیلو۔ ہو سکتا ہے دوڑنے سے کانٹا نکل جائے۔"

علی نے کہا۔ "چلو یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔"

آدھا گھنٹہ کھیل ہو چکا تھا۔ کھیل ختم ہونے میں تھوڑی دیر باقی تھی۔ علی کی ٹیم ایک گول سے پیچھے تھی۔ آخری لمحات میں گیند علی کے پاس آئی۔ وہ تیزی سے گیند لے کر گول کی طرف بڑھا اور گول کیپر سے بھی گیند بچالی اب وہ تھا اور خالی گول۔ علی نے ایک قدم آگے بڑھایا تاکہ گیند گول میں پھینک دے۔ عین اسی وقت اس کے گلے میں شدید درد ہوا اور

پورے بدن میں پھیل گیا اس کو ایسا لگا کہ سارا بدن خشک ہو گیا ہے سر بھاری ہو گیا آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ابھی علی سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ گول کیپر نے اس سے گیند لے کر دور پھینک دی۔

اس طرح گول برابر کرنے کا بہترین موقع علی کی ٹیم کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ دوستوں نے اس کو ہر طرف سے گھیر لیا اور ملامت کرنے لگے۔ علی گلا پکڑے گھر چلا آیا۔ اس کو اس بات کا بھی رنج تھا کہ اس کی بنا پر اس کی ٹیم ہار گئی۔ گرچہ اس میں اس کی کوئی غلطی نہ تھی ساری غلطی بدبخت کانٹے کی تھی۔ جس نے ڈاکوؤں کی طرح راستہ بند کر دیا تھا۔ علی گھر میں

داخل ہوا۔ کمرے میں پہنچ کر ایک کونے میں بے حال پڑ گیا۔

اب رات آئی۔ اس کے والد آفس سے گھر واپس آئے۔ مغرب کی اذان کی آواز آنے لگی۔ علی نے اٹھ کر بادل ناخواستہ وضو کیا اور باپ کے ساتھ مغرب عشا کی نمازیں ادا کیں۔

نماز کے دوران درد میں اضافہ ہو جاتا تھا اور آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔

رات کے کھانے کے لئے دستر خوان بچھایا گیا۔ لیکن علی کچھ نہ کھا سکا۔ وہ بس پلیٹ سے کھیلتا رہا۔ اس نے ایک گلاس پانی

پیا اور بڑی مشکل سے تھوڑا سا خربوزہ کھایا۔ اس کی حالت دیکھ کر باپ نے پوچھا۔ " کیا زیادہ درد ہورہا ہے۔" یہ سوچتے ہوئے کہ باپ زیادہ پریشان نہ ہوں، علی نے کہا۔ " نہیں بہت زیادہ درد نہیں ہے۔"

کھانا کھانے کے بعد علی اپنے کمرے میں گیا۔ بستہ سے کتابیں نکالیں تاکہ ہوم ورک پورا کرلے۔ لیکن اس وقت بھی اس کی طبیعت مضمحل تھی۔ اس نے کتاب کھول کر سبق پڑھنا چاہا کئی مرتبہ کتاب کو کھولا۔ بند کیا۔ تصویریں دیکھیں لیکن پڑھ نہیں سکا آخرکار اس نے بستہ بند کردیا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں بھی اس کا دل نہیں لگا۔ سونے کے لئے مکان کی

چھت پر چلا گیا۔ ماں نے اس کے لئے بستر بچھا دیا تھا۔ بے حال ہو کر لیٹ گیا۔ اور ستاروں کو دیکھنے لگا۔

اس وقت درد بھی زیادہ ہوگیا تھا۔ اتنا زیادہ درد ہو رہا تھا کہ دل چاہ رہا تھا کہ چاقو سے گلا کاٹ دے اور کسی طرح کانٹا باہر نکال دے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی طاقت جواب دے رہی ہے۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا اور نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔

علی نے کئی مرتبہ کروٹ بدلی، دیر تک آنکھوں کو بند کئے رہا زور زور سے آنکھیں بند کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ نیند اس

سے ناراض ہے۔ آخرکار اس نے آنکھ کھول دی اور ستارے شمار کرنے لگا۔ ایک۔دو۔ تین۔ چار۔ دس۔ بیس۔ پچاس۔ سو۔ لو بھول گیا۔ پھر سے۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پھر غلطی ہو گئی۔ ایک، دو، تین۔

علی نے بار بار ستارے گننے چاہے مگر ہر مرتبہ بھول جاتا تھا۔ یہی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کہاں سے گننا شروع کیا ہے۔ اس نے تنگ آ کر ستارے گننا چھوڑ دیئے۔

آہستہ آہستہ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ زیادہ تر لوگ سوچ چکے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ آسمان میں ایک دم دار ستارہ نمودار ہوا اور غائب ہوگیا۔ رفتہ رفتہ

ستارے بھی ڈوبنے لگے۔ پورے شہر پر سکوت طاری ہوگیا تھا۔ سارا شہر گہری نیند سو رہا تھا۔ مگر علی کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان نہ تھا۔ ایک ایک لمحہ اس کے لئے ایک ایک صدی کے برابر تھا۔ وہ چاہتا تھا جلد صبح ہو اور اس پریشانی سے نجات ملے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آج صبح ہوگی ہی نہیں۔ بس ہمیشہ رات ہی رہے گی۔ کوئی ایسا نہیں جو صبح کو کھینچ کر لے آئے۔

بہت آہستہ آہستہ وقت گذر رہا تھا۔ جب علی کو بستر پر چین نہیں ملا اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ جس طرف دیکھتا ہر طرف بس سکوت ہی سکوت۔ سناٹا ہی سناٹا۔ وہ کسی نہ کسی

طرح اپنے کو بہلاتا رہا۔ جب تھک جاتا تو بیٹھ جاتا تھا۔

علی نے ایک مرتبہ پھر سونے کی کوشش کی ۔ چہرہ تکیہ میں چھپایا۔زور سے آنکھیں بند کیں مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ نیند نہ آنا تھی نہ آئی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ شیطان نے اس کی نیند چرالی ہے۔ اس نے شیطان پر خوب لعنت بھیجی۔

یہ پہاڑ جیسی رات کسی نہ کسی طرح ختم ہونے کو آئی۔ تاریکی میں کچھ کمی آئی۔ مرغ نے لوگوں کو جگانے کے لئے آواز بلند کی۔ مسجد سے اذان کی آواز آنے لگی۔ اور پورے شہر میں اللہ اکبر کی صدا گونجنے لگی۔

علی کے والد نماز کے لئے اٹھے۔ علی کو آواز دی۔ "علی، علی۔ اٹھو نماز کا وقت ہے۔" علی تو پہلے ہی سے بیدار تھا۔ لہٰذا آج معمول کے برخلاف اٹھنے میں دیر نہیں لگی۔ نیچے جاکر وضو کیا اور آہستہ آہستہ نماز پڑھی۔ ماں نے نماز کے بعد چائے بنانے کے لئے پانی رکھ دیا۔

علی ناشتہ کے لئے کچھ لینے باہر چلا گیا۔ چونکہ صبح کا وقت تھا اور کوئی خاص بھیڑ نہیں تھی جلدی ہی واپس آگیا۔

ماں نے اس کے لئے چائے بنائی۔ مگر وہ نہ پی سکا اور نہ ہی کچھ کھا سکا۔ کسی نہ کسی طرح ایک آدھ گھونٹ چائے گلے

سے نیچے اتاری۔ اس کے گلے میں جلن ہورہی تھی اور آنکھوں میں سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ باپ نے اس کی پریشانی دیکھ کر کہا۔ "چلو تمہیں ڈاکٹر کو دکھادیں۔"

علی نے کہا۔ "ابھی رہنے دیجئے ہوسکتا ہے دوپہر تک ٹھیک ہی ہوجائے۔"

اس کے بعد علی وہاں سے اٹھ گیا۔ اس نے اسکول کا ڈریس پہنااور بستہ لے کر اسکول چلا گیا۔ اب اس وقت درد کے ساتھ ساتھ بھوک بھی لگ رہی تھی کمزوری بھی محسوس ہورہی تھی رات بھر نہ سونے کی بناپر تھکن بھی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا اسکول

لے گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی قیدی کو زبردستی لے جایا جارہا ہو۔

علی کسی نہ کسی طرح اسکول پہنچا۔ دوستوں سے علیک سلیک ہوئی ۔ اسکول کے میدان میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ علی کے کچھ دوست فٹبال کھیل رہے تھے۔ انہوں نے علی کو بلایا لیکن علی نے انکار کردیا۔ وہ ایک کنارے بیٹھ کر کھیل دیکھتا رہا۔ اتنے میں گھنٹی بجی۔ بچے اپنی اپنی کلاس میں چلے گئے۔ استاد نے آکر سب سے پہلے بچوں کی حاضری لی پھر لڑکوں سے ہوم ورک مانگا۔ سب نے اپنی اپنی کاپیاں استاد کے سامنے رکھ دیں یہاں تک

کہ علی کی باری بھی آ گئی آج پہلی مرتبہ علی نے ہوم ورک نہیں کیا تھا۔ استاد کو علی سے یہ توقع نہیں تھی۔ استاد نے علی سے پوچھا۔ "ارے تمہیں کیا ہو گیا۔ آج تم نے ہوم ورک کیوں نہیں کیا؟"

علی نے کہا۔ "استاد میں بیمار ہوں۔"

استاد نے علی کو غور سے دیکھا۔ چہرے کا رنگ اڑا اڑا تھا علی سے کہا "خیر کوئی بات نہیں جب ٹھیک ہو جانا تو مکمل کر لینا۔" ہوم ورک دیکھنے کے بعد استاد نے لڑکوں سے سبق سنا۔ علی کی خوش قسمتی کہ آج استاد نے اس سے سبق نہیں سنا۔

دوسری گھنٹی بجی۔ یہ سائنس کی گھنٹی تھی۔ یہاں استاد نے سب سے پہلے علی

سے سوال کیا۔ جیسے ہی استاد کی زبان سے علی کا نام آیا۔ علی کا رنگ اڑ گیا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ استاد نے دوسری مرتبہ علی کو پکارا۔ علی اپنی جگہ سے اٹھا۔

"جب تمہیں بلا رہا ہوں تو آتے کیوں نہیں؟"

علی نے پھنسی ہوئی آواز میں کہا۔ "استاد میں کل بیمار تھا۔ اس لئے سبق یاد نہیں کر سکا۔"

استاد نے پوچھا۔ "کیا ہو گیا ہے؟"

علی نے کہا۔ "استاد میرے گلے میں کانٹا اٹک گیا ہے۔"

علی کا جواب سن کر لڑکے ہنس دیئے۔ علی شرمندہ ہو گیا اور اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

استاد نے لڑکوں سے کہا۔ "میں نے تم لوگوں سے بار بار کہا ہے کہ پہلے سبق یاد کر لیا کرو۔ تم اس کو سب سے آخر میں رکھتے ہو۔ اس وقت کوئی نہ کوئی پریشانی پیش آ جاتی ہے اور سبق رہ جاتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد انٹرول ہو گیا۔ لڑکے میدان میں کھیلنے کے لئے جمع ہو گئے۔ پورے میدان میں ایک ہنگامہ تھا۔ علی ایک کنارے خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا۔

علی کا بہترین دوست محمود اس کے پاس وہیں سیڑھی پر بیٹھ گیا اور اس کو کھیلنے کے لئے بلانے لگا۔ علی نے کہا۔

"میرا دل بالکل نہیں چاہ رہا ہے۔ مجھے رہنے دو۔"

محمود نے پوچھا۔ "ایک معمولی سے کانٹے سے کتنا درد ہوتا ہے کہ تم اتنا زیادہ آہ آہ کر رہے ہو۔"

علی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

محمود نے کہا۔ "منھ کھولو دیکھیں کانٹا ہے کہاں؟"

علی نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔

محمود نے بہت ہی منت سماجت سے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا تاکہ اس کا منھ کھول کر کانٹا دیکھ سکے۔ علی جو بہت زیادہ پریشان

تھا اور ہر چیز سے بیزار تھا۔ اس نے محمود کو دھکا دے دیا۔ محمود نیچے گر پڑا۔ اس کے سر میں چوٹ آئی۔ گرنے کی آواز سن کر بچے محمود کے گرد جمع ہوگئے اور اس کو اٹھانے لگے۔

یہ محمود کی خوش قسمتی کہ اس کا سر نہیں پھوٹا۔ لیکن سر اچھا خاصا سوج گیا لڑکوں نے علی کی ملامت کی۔ "تم نے کیوں محمود کو دھکا دیا۔"

ایک لڑکے نے محمود سے کہا۔ "جاؤ۔ پرنسپل سے شکایت کردو۔"

لیکن محمود نے یہ کام نہیں کیا۔ وہ وہیں زمین پر بیٹھا اپنا سر سہلاتے ہوئے کہنے لگا:

"اب میں تم سے کبھی نہیں بولوں گا۔"

لڑکے کھیلنے چلے گئے۔ علی کو اپنی اس حرکت پر بہت زیادہ افسوس تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ گلے کا درد بھی پریشان کئے جاتا تھا۔ اس کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی کلاس میں جا کر اکیلے میں رونے لگا۔

جب اسکول سے علی گھر واپس آیا۔ رنگ اڑا ہوا تھا۔ چہرے پر ورم تھا۔ آنکھوں میں حلقے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ علی گھر میں داخل ہوا۔ اس کا چھوٹا بھائی مرتضٰی دوڑتا دوڑتا اس کے

پاس آیا اور کہنے لگا۔ "جناب علی ۔ سلام، سلام اور علی کے پیروں سے لگ گیا۔

علی پریشان تھا۔ سارا جسم درد میں مبتلا تھا۔ اس نے غصہ میں بھائی کو جھٹک دیا اور مارا۔ مرتضٰی رونے لگا زمین پر لیٹ گیا اور ماں کو پکارنے لگا۔

ماں باورچی خانہ سے تیزی سے آئی۔ مرتضٰی کو اٹھایا پیار کیا اور علی کو ڈانٹنے کے لئے اس کے کمرے میں گئیں۔ لیکن جب دیکھا کہ علی کی حالت ہی غیر ہے تو غصے کو ضبط کرکے باورچی خانے میں واپس چلی آئی۔

کھانا تیار تھا۔ باپ کا انتظار ہو رہا تھا۔ تینوں دسترخوان پر بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ علی کو بہت بھوک لگی تھی۔ اس نے

کل سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس نے لقمہ منھ میں رکھا لیکن نگل نہیں سکا۔ آخرکار لقمہ باہر نکال دیا۔

علی دسترخوان سے اٹھ گیا۔ اور ایک کنارے لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ شاید نیند آجائے اور درد بھول جائے۔ لیکن درد اتنا زیادہ تھا کہ وہ نہیں سوسکا۔ اور بے اختیار بلند آواز سے رونے لگا۔

رونے کی آواز سن کر ماں فوراً آئی۔ پیشانی پر ہاتھ رکھا دیکھا بخار سے جل رہی ہے کپڑا بھگو کر اس کا پسینہ پوچھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے والد آگئے۔ علی کی حالت دیکھ کر فوراً اسے ڈاکٹر کے یہاں لے گئے۔

ڈاکٹر نے منھ کھول کر دیکھا مگر کچھ نظر نہیں آیا۔ گلے پر دھیرے دھیرے ہاتھ رکھا اور آہستہ آہستہ دبایا۔ علی چیخ اٹھا اراس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "میں اس کو نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر آسانی سے نکل آیا تو ٹھیک ہے ورنہ آپریشن کرنا پڑے گا۔"

یہ سن کر باپ کا رنگ اڑ گیا۔ "کیا حالت اتنی خطرناک ہے؟"

ڈاکٹر نے کہا۔ "خدا بہتر جانتا ہے۔ جب تک پوری طرح دیکھ نہ لوں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" اس کے بعد کہنے لگا۔ "دعا کیجئے کہ آپریشن کی نوبت نہ آئے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر نے علی کے والد سے کہا۔ "علی کا منھ کھولے رہیں اور سر مضبوطی سے پکڑے رکھیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے ایک آلہ نکالا جس کا ایک سرا باریک اور ہلکا سا مڑا ہوا تھا۔ علی کا گلا دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا۔ "بیٹا تم بہادر ہو۔ آج اپنی بہادری ثابت کردو۔ منھ کھولے رہو اور ناک سے سانس لو۔"

ڈاکٹر نے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کہہ کر آلہ علی کے گلے میں ڈال دیا۔ چند مرتبہ اس کو کھولا اور بند کیا۔ درد اتنا شدید تھا علی زور سے چیخنا چاہتا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا ایک ساتھ ہزاروں سوئیاں اس کے گلے

میں داخل کر دی گئی ہیں۔ وہ دیوار سے سر ٹکرانا چاہتا تھا۔ آنکھوں کے حلقے سیاہ ہو گئے تھے۔ پیشانی پر ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود علی رویا نہیں۔ بس اس نے آنکھیں بند کر لیں تاکہ آنسو نہ نکلنے پائیں۔

آخرکار وہ آلہ ایک چیز سے ٹکرایا۔ ڈاکٹر نے اس کو بہت ہی آہستہ آہستہ حرکت دی اور دھیرے دھیرے اس کو باہر نکالا۔

خون میں تر ایک چھوٹا سا کانٹا۔ ڈاکٹر نے علی اور اس کے باپ کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

علی کے باپ نے پوچھا۔ "اتنے چھوٹے سے کانٹے نے میرے بچے کو ہلکان کر دیا۔"

آپ بھولیں نہیں "نمرود کو ایک معمولی سے مچھر نے ہلاک کر دیا تھا۔"

اس کے بعد ڈاکٹر نے نسخہ لکھ دیا۔ "دو تین دن بہت ہی نرم غذا کھائیں اور یہ دوا استعمال کریں انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس رات علی نے خالی سوپ پیا۔ ماں نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "میرے لال نے دو دن بہت تکلیف اٹھائی۔"

باپ نے کہا۔ "اب میرا بیٹا اس لائق ہوگیا ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے درد و غم کو باقاعدہ محسوس کرسکے۔"

اس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا:

جس وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقال ہوا خدا کے حکم کے مطابق حضرت علی علیہ السلام کو خلیفہ ہونا چاہئے تھا لیکن حکومت طلب افراد نے لوگوں کی جہالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تلوار کے بل بوتے پر خلافت پر قبضہ کرلیا۔

جب حضرت علی علیہ السلام نے اپنے حق کا مطالبہ کرنا چاہا تو ان کے گھر کو آگ لگا دی گئی ان کی زوجہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی پسلی توڑ دی گئی۔ جس کے

نتیجے میں جناب محسن کی شہادت واقع ہوئی اور اسی بنا پر جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کی شہادت ہوئی۔

صرف چند لوگ ایسے تھے جو اپنے ایمان پر باقی اور حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ تھے۔ ان لوگوں کو بھی حد سے زیادہ ستایا گیا، مارا گیا اور شہر سے نکال دیا گیا اور بعض کو شہید کر دیا گیا۔ ایسی حالت میں حضرت علی علیہ السلام نے خدا کے حکم سے ۲۵ سال صبر کیا۔

حضرت علی علیہ السلام نے اس ۲۵ برسوں کے بارے میں خود ارشاد فرمایا ہے:

"میں نے دیکھا صبر کرنا زیادہ بہتر ہے۔ میں نے اس حالت میں صبر کیا کہ میری آنکھ میں تنکا تھا اور حلق میں کانٹا۔ میں دیکھ رہا تھا اور میری میراث برباد کی جارہی تھی۔"

علی کے والد نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

"میرے بیٹے نے صرف ایک دن یہ درد برداشت کیا۔ جب کہ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے ۲۵ سال یعنی تقریباً ۹ہزار دن تک درد برداشت کیا وہ بھی صرف اس لئے کہ اسلام برباد نہ ہونے پائے۔ اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ اب میرا بیٹا مولا کے درد کو بہتر محسوس کرسکتا ہے۔"

کھانے کے بعد ان دو دنوں میں جو کچھ ہوا تھا علی نے سب اپنے بابا سے بیان کر دیا۔ جب علی سب بیان کر چکا تو باپ نے کہا۔ "خداوند عالم کبھی کبھی انسان کے امتحان کے لئے بلائیں بھیجتا ہے۔ بعض افراد بلاؤں میں صبر نہیں کر پاتے خدا کی رحمت سے مایوس ہو جاتے ہیں اور برے برے کام انجام دینے لگتے ہیں اس طرح کے لوگ امتحان میں ناکام ہو جاتے ہیں۔

لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو صبر سے کام لیتے ہیں وہ خدا کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہوتے بلکہ وہ مصیبتوں میں خدا کو اور زیادہ یاد کرتے ہیں۔ اور وہ گناہ

جن کی بناپر بلائیں نازل ہوتی ہیں اس سے معافی مانگ لیتے ہیں خدا کی بارگاہ میں توبہ اور استغفار کرتے ہیں۔ اس قسم کے افراد امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں۔

میرے لال تم اس امتحان میں کامیاب نہیں ہوئے۔ گلے میں کانٹا اس لئے اٹکا تھا کہ تم جلدی جلدی کھا رہے تھے۔ اس کے باوجود بھی تم اپنے قابو میں نہیں رہے جس کی بناپر تم سے کتنی غلطیاں ہوئیں۔ تم نے ہوم ورک نہیں کیا، سبق یاد نہیں کیا۔ استاد کو ناراض کیا، اپنے بہترین دوست کو دھکا دیا اس کو اپنے سے ناراض کیا، اپنے چھوٹے بھائی کو بلاوجہ مارا۔

علی نے کہا بابا "مجھے اپنی غلطیوں کا احساس ہے اور میں بہت شرمندہ ہوں اب کیا کروں۔"

باپ نے کہا۔ "سب سے پہلے توبہ کرو اور نماز کے بعد خدا سے یہ وعدہ کرو کہ آئندہ ہر گز ایسا نہیں کروگے۔"

علی نے چھوٹے بھائی مرتضٰی کو گلے سے لگایا پیار کیا اور وعدہ کیا کہ والد کی باتوں پر عمل کرے گا۔ اس کے بعد اس نے وضو کیا۔ نماز پڑھی اور خدا کی بارگاہ میں اپنی غلطیوں کی معافی مانگی۔

پہلا سبق

اصغر نے کمرے کی کھڑکی کھولی اور باہر دیکھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ دیہات کا وہ جوش و خروش نظر نہیں آرہا تھا۔ البتہ وہاں سے کچھ فاصلے پر لہلہاتے کھیت اور سرسبز باغات تھے۔ جس کو دیکھ کر دل و دماغ تازہ ہوجاتا تھا۔ دیہات کے کسان مزدور وہیں کام کررہے تھے۔ گیہوں کے پودے بڑے ہوگئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہوا کی سرگوشی کسانوں کو بہت ہی اچھی لگتی تھی۔ وہ اس کو اپنی زندگی خیال کرتے تھے۔ گیہوں کے پودوں کے درمیان چلنے والی ہوا ان کے کان میں کوئی راز کی بات کہہ رہی تھی۔ ہوا کے

جھونکے رحمت کا پیغام لاتے تھے جس سے کسانوں کا دل باغ باغ ہو جاتا تھا۔

فصل کٹنے کے دن آ گئے تھے۔ دیہات کے کسان اپنے اپنے کھیتوں میں فصل کاٹنے میں مصروف تھے۔ کمر کسے۔ تیز اور چمکدار ہنسیا سے کھیت کاٹ رہے تھے۔ اور بوجھ بنا بنا کر الگ الگ رکھ رہے تھے اور کھلیان بنا رہے تھے۔

اصغر کے والدین اور اس کے چھوٹے بھائی کھیت میں کام کر رہے تھے۔ اگر وہ غور سے دیکھتا تو ان لوگوں کو کھیت میں کام کرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ چونکہ اصغر ابھی

گھر واپس آیا تھا۔ تھکا تھا لہٰذا اس بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔

اصغر نے دوسری طرف دیکھا۔ وہاں اونچائی پر ایک باغ تھا جس میں مختلف پھل نظر آرہے تھے۔ باغ کے چاروں طرف مٹی کی دیوار بنی ہوئی تھی۔ چونکہ سب لوگ کھیت میں کام کررہے تھے لہٰذا باغ میں سناٹا تھا۔

سورج اپنے عروج پر تھا۔ دیہات کی مسجد سے اذان کی آواز آرہی تھی دوپہر کا وقت تھا اصغر بھوکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا معلوم نہیں یہ لوگ کب واپس آئیں گے اور کھانا پکے گا۔ اس نے جو خود کو جواب دیا وہ مایوس کرنے والا تھا۔ یہ لوگ غروب آفتاب سے پہلے واپس نہیں آئیں

گے یعنی اس وقت تک بھوکے رہنا پڑے گا۔

اصغر کھڑکی سے نیچے اترا۔ اس نے گھر کی تلاشی لی شاید کچھ کھانے کو مل جائے طاق، باورچی خانہ، الماری، کارنس۔ نعمت خانہ۔ اسٹور۔ سب جگہ دیکھ ڈالی۔ روٹی کے بس چند ٹکڑے ہی مل سکے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ یہ روٹی کس چیز کے ساتھ کھائے۔

فصل پک کر تیار ہو چکی تھی۔ تمام کسانوں کی طرح اصغر کے والدین کو بھی یہ فکر تھی کہ کسی طرح فصل کٹ جائے اور گھر پہنچ جائے ورنہ بارش اور آندھی

سے سب برباد ہو جائے گی۔ اصغر کی ماں کو بھی یہ خیال نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی واپس آ جائے گا۔ ورنہ اس کے لئے کچھ نہ کچھ پکا کر جاتی۔

جب اصغر ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو ایک مرتبہ پھر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا اور اس کی نگاہیں بے اختیار باغ کی طرف اٹھ گئیں۔ اس نے دیکھا باغ میں کوئی نہیں ہے اور ہوا جھونکوں سے درخت بھی اونگھ رہے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ درختوں میں پھل لگے ہوئے ہیں جن کی رنگت اور تازگی میں عجب کشش ہے۔ درخت کی اونچی اونچی شاخیں پھلوں سے لدی تھیں اور وہ اتنی زیادہ جھک گئی تھیں کہ

اصغر ہاتھ بڑھا کر انہیں آسانی سے توڑ سکتا تھا۔

اصغر دیر تک ادھر اُدھر ٹہلتا رہا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ ایک مرتبہ وہ رکا ذہن میں کوئی فیصلہ کیا اور گھر سے باہر نکل آیا۔ دیہات کی تنگ اور ٹیڑھی گلیوں سے ہوتا ہوا باغ تک پہنچ گیا۔ باغ میں کئی قسم کے پھل لگے ہوئے تھے۔ ایک درخت پر اس کی نظریں جم گئیں۔

باغ کا دروازہ بند تھا۔ اصغر نے دروازے کو دھکا دیا وہ چرچرا کر کھل گیا۔

عین اسی وقت کسی کے سلام کرنے کی آواز آئی۔

اصغر۔ سلام علیکم

اصغر نے مڑکر دیکھا۔ اس کا پرانا دوست احمد سامنے تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ہنسیا تھی اور دوسرے ہاتھ سے گٹھر سنبھالے ہوئے تھا۔

دیہات کے سب ہی لوگ احمد کو پہچانتے تھے۔ چھوٹے اس کی عزت کرتے تھے اور بڑے اسے پیار کرتے تھے۔ کیونکہ ابھی تک اس نے کوئی برا کام نہیں کیا تھا۔

احمد ہوشیار اور بہت محنتی تھا۔ وہ اپنا کام کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کا بھی ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔

اصغر تھوڑی دیر اسی طرح گم صم کھڑا رہا۔ اس نے احمد سے کہا۔ "کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟"

احمد نے کہا۔ "کیوں نہیں۔" احمد نے ہنسیا اور گٹھڑ وہیں زمین پر رکھ دیا دونوں باغ میں داخل ہوگئے اور اس درخت کی طرف چل دیئے۔

ابھی تک احمد کو کچھ نہیں معلوم کہ اصغر کیا کرنا چاہتا ہے وہ بھی اصغر کے ساتھ چلتا رہا یہاں تک کہ دونوں اس درخت کے نیچے پہنچ گئے۔

احمد نے دل ہی دل میں کہا "اصغر نے باغ کے مالک سے اجازت بھی لی ہے یا نہیں؟"

ابھی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اصغر کی آواز آئی۔ "احمد ذرا دیکھتے رہنا۔ کوئی آتو نہیں رہا ہے۔"

احمد کو اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ احمد کو یقین ہوگیا کہ اصغر نے اجازت نہیں لی ہے۔ وہ مالک کی اجازت کے بغیر باغ سے پھل توڑنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اگر وہ اس کام میں اصغر کی مدد کرے تو وہ خود بھی گناہ میں شریک ہوگا۔

احمد کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ کس طرح وہ اپنے دوست کو اس گناہ سے روکے اور گناہ نہ کرنے دے۔ اسی

دوران اصغر نے ادھر اُدھر دیکھا جب کوئی نظر نہیں آیا تو وہ درخت پر چڑھنے لگا۔ تھوڑا سا اوپر جاتا اور ادھر اُدھر دیکھتا تھا کہ کوئی آتو نہیں رہا ہے۔

یہاں تک کہ وہ اوپر پہنچ گیا۔ اب وہ آسانی سے پھل توڑ سکتا تھا۔

اصغر نے ایک ہاتھ سے ٹہنی کو پکڑا تاکہ گرنے نہ پائے اور دوسرا ہاتھ پھل توڑنے کے لئے آگے بڑھایا۔ اس کا ارادہ تھا کہ پھل توڑ توڑ کر احمد کو دیتا جائے۔

اصغر کا ہاتھ پھل تک پہنچا ہی تھا کہ آواز آئی۔

"اصغر۔اصغر۔ جلدی اترو کوئی ہمیں دیکھ رہا ہے۔"

یہ سنتے ہی اصغر نے ہاتھ کھینچ لیا اور جلدی جلدی اترنے لگا۔ اس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا اور چہرے کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ اس نے وہیں سے پوچھا:

"کون ہے؟ کہاں ہے؟ کس نے ہمیں دیکھا؟"

وہ جلدی جلدی اتر رہا تھا اور ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں دیکھنے والے کو تلاش کر رہی تھی۔ لیکن اسے کوئی نظر نہیں آیا۔

اس نے اتر کر احمد سے پوچھا:

"وہ شخص کہاں گیا جس نے ہمیں دیکھا ہے؟"

احمد نے بہت ہی نرم لہجے میں کہا:

"وہ خدا ہے۔ جو ہر چیز کو دیکھ رہا ہے اور ہر چیز کو جانتا ہے۔ لیکن کوئی اس کو نہیں دیکھ سکتا۔"

احمد کا جواب سن کر اصغر شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ پھر اس نے کبھی چوری نہیں کی۔ بلکہ چوری کی فکر تک نہیں کی۔

بھوپال ترجمہ
Translation Movement